ڈاکٹر شگفتہ حسین
صدر شعبۂ اُردو،
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی برائے خواتین، ملتان

ایک ترقی پسند مجلّے کا غیر ترقی پسند مدیر

Adab-e-Latif a monthly Urdu literary journal started publishing in March 1935 from Lahore. From September 1935 to September 1962 it was the spokesman of progressive movement. In October 1962 its editorship was offered to legendary Intizar Hussain who accepted it on his own terms and conditions. He is an out spoken critic of progressive writers and has his own world of ideas. He entered that domain as a forceful editor with his own policy and style. He worked there only for a short period but it was enough to make history. His dynamic personality changed the entire world of Adab-e-Latif, the journal was no more an organ of progressive literature then. Certainly "it is power that decides discourse." Once a powerful domain, collapsed, and a new empire was built by Intizar Hussain. It was 1981, when progressive writers again conquered their fortress.

انتظار حسین کے قارئین ان کے مزاج اور اُفتادِ طبع سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے افسانے، ناول، تنقید، تراجم میں ان کی شخصیت فرار نہیں اظہار پاتی ہے۔ جس زمانے میں انھوں نے اپنی کہانی کا ڈول ڈالا وہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا، لیکن انھوں نے ترقی پسندوں سے الگ اپنی راہ نکالی کیوں کہ بقول ان کے:

> ترقی پسند تحریک نے افادی ادب کی جو ترکیب تراشی تھی اور ادب کی افادیت پر اصرار کیا تھا اس نے مجھے اس وقت بھی متاثر نہیں کیا تھا جب اجتماعی اور غیر ذاتی معنوں میں افادیت کی تشریح کی جاتی تھی۔ میں بچپن سے غیر مفید چیزوں کا رسیا رہا ہوں۔[1]

بڑا عجیب لگتا ہے جب یہ بچپن سے غیر مفید چیزوں کا رسیا انسان ''ادبِ لطیف'' جیسے پرچے کا مدیر بنتا ہے جس کا اوڑھنا بچھونا ہی وہ تحریریں تھیں جو ادب کی افادیت اور ہمہ گیری کے ہمہمے سے بھری پڑی تھیں اور اکثر تو ایسی مزاحمتی اور ترقی پسندانہ تھیں کہ ان کی اشاعت کے سبب یہ پرچہ کئی بار اپنی ضمانت ضبط کرا بیٹھا اور اکثر تو یوں ہوا کہ اس کی اشاعت پر پابندی لگ گئی۔ کئی کئی ماہ پرچہ شائع ہی نہ ہوا، لیکن یہ کریڈٹ بھی انتظار حسین کو جاتا ہے کہ انھوں نے اس ترقی پسند رجحان ساز مجلّے کی ادارت سنبھالی تو اس کی ترقی پسندی کے غبار سے ایسی ہوا نکالی کہ پھر ۱۹۸۰ء تک اس پرچے کو کوئی ترقی پسند مدیر نصیب نہ ہوا۔ یہ تو بھلا ہو ضیائی مارشل لاء کا

کہ حالات میں تبدیلی آئی اور کشور ناہید نے ادبِ لطیف کو ایک بار پھر مزاحمتی اور ترقی پسندانہ تحریروں کا ترجمان بنا دیا۔

ادبِ لطیف کا اجراء مارچ ۱۹۳۵ء میں لاہور سے ہوا تھا۔ اس کے مالک چوہدری برکت علی تھے۔ ابتدا میں پرچے کا انداز ایسا تھا کہ نیرنگِ خیال جیسے اعلیٰ ادبی پرچے نے اس کی ہجو ملیح کرتے ہوئے اس کی طباعت و کتابت کو سراہنے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ چوں کہ اس میں تعلیمی ضروریات کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے ''مدارس میں زیادہ مقبول ہوگا۔''[۲] لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ قائم نہیں رہی اور مرزا ادیب اور دوسرے مدیروں نے اس مجلّے کو ایک رجحان ساز پرچہ بنا دیا۔ ستمبر ۳۵ء سے ستمبر ۴۰ء اور پھر مارچ ۴۹ء سے جولائی ۶۲ء تک مرزا ادیب نے اس پرچے کی شاندار تاریخ رقم کی جب کہ اکتوبر ۴۰ء سے فروری ۴۹ء تک راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور عارف عبدالمتین جیسے کٹر ترقی پسند ادیب و شاعر اس کی ادارتی ذمہ داریاں نبھاتے اور اس کی ساکھ کو مضبوط کرتے رہے۔

انتظار حسین بحیثیت افسانہ نگار و ناول نگار اتنے معروف ہیں کہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو کہ وہ کسی ادبی مجلّے کے مدیر رہے شاید اتنا اہم نہ ہو لیکن میرے نزدیک اس کی بہت اہمیت بنتی ہے کہ انھوں نے اکتوبر ۶۲ء سے جون ۶۵ء تک کی مختصر مدت میں اپنے مخصوص نظریات اور اُفتادِ طبع سے اتنے مضبوط پرچے کی پالیسی یکسر بدل دی اور اس پرچے کو وہی رنگ دیا جو ان کا اپنا تھا نہ کہ جو اس کی گزشتہ تاریخ تھی۔

چوہدری افتخار علی سے اختلافات کے سبب مرزا ادیب ادبِ لطیف کی ادارت سے الگ ہو گئے[۳] تو چوہدری افتخار علی نے انتظار حسین کو مدیر بننے کی دعوت دی۔ برسوں پہلے جون ۱۹۹۷ء میں مجھے انتظار حسین سے ایک انٹرویو کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ انھوں نے ادبِ لطیف کا مدیر بننے کے بارے میں بتایا کہ جب چوہدری افتخار علی نے ادارت کے لیے کہا تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ترقی پسند نہیں ہیں۔ گو ان دنوں آفاق بند ہوگیا تھا اور وہ فری لانسر تھے، لیکن انھوں نے کہا کہ وہ اس کے باوجود کسی ادبی پرچے کو ادبی شوق میں سنبھالنے کو تیار نہیں، لیکن چودھری صاحب نے کہا کہ وہ معقول تنخواہ بھی لیں اور اپنے ادبی رجحان کے مطابق کام کریں۔ انتظار حسین کے بقول ترقی پسندوں خصوصاً میرزا ادیب اور ظہیر کاشمیری جیسے لوگوں نے ان کی ادارت کو پسند نہیں کیا۔ ''چراغوں کا دھواں'' میں اس ادارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ادبِ لطیف کی ادارت ایک اچھے خاصے ہنگامے میں شروع کی تھی یعنی یہ ادارت 'خیال' کی ادارت سے مختلف تھی۔ وہاں مقصود یہ تھا کہ ہنگامہ پیدا کیا جائے۔ یہاں یار و اغیار نے خود ہی ہنگامہ پیدا کر دیا۔''[۴]

اور اس ہنگامے میں مزید اضافہ انھوں نے خود بھی کیا۔ اکتوبر ۶۲ء کا پرچہ ان کی زیرِ ادارت پہلا پرچہ تھا اور اس کے اداریے کا پہلا جملہ تھا:

> ''ادبِ لطیف کو ایک معیاری ادبی پرچہ بنانے یا بنائے رکھنے کا میں وعدہ نہیں کروں گا، معیاری ادبی رسالے اردو میں اس وقت بہت نکل رہے ہیں اور ابھی اور نکلیں گے، جو رسالہ ہمیں چاہیے اور نہیں ملتا وہ ایک غیر معیاری ادبی رسالہ ہے۔''[۵]

انھوں نے ''مجھے اختلاف ہے'' کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا، اس کے علاوہ نقادوں سے دس سوال، تخلیقی لکھنے والوں سے دس سوال، مذاکرے ادبی لوگ اور میرا ہم عصر جیسے کئی نئے سلسلے شروع کیے۔ وہ پرچے کو ایک نیا رنگ دے رہے تھے۔

مثلاً ''میرا ہم عصر'' میں تو یہ صورت تھی کہ کوئی چھوٹا سا مضمون، کوئی خط، چلتے چلتے ملاقات، کوئی سرراہے گفتگو، سب شامل ہوتا تھا۔

انتظار حسین کو ماضی میں جینا پسند ہے، لیکن حاضر میں رہ کر۔ اور وہ خود کو سن ستاون کے ہارے ہوئے لشکر کا سپاہی مانتے ہیں جو کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا اور آتش رفتہ کا سراغ لیتا پھرتا ہے[6]۔ وہ اپنی جڑیں اپنی پرانی تہذیب اپنی پرانی داستانوں میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

> ''فکشن کی قدیم روایات کی مجھے تلاش ہوئی تو میں نے گوتم بدھ کی جاتک، شیخ سعدی کی حکایات اور انجیل کی تمثیلوں کو اپنے لیے بہت مفید پایا۔ انبیاء اور صوفیا فکشن کے پیرائے میں بات کرتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''[7]

پہلے ہی پرچے میں ''پتھر کے ورق'' کے عنوان سے انھوں نے مستقل سلسلہ شروع کیا جس میں پرانی داستانوں کے اقتباس جگہ پاتے کہ ہمارا ورثہ ہیں۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ ہم نے ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک اور اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے افسانے کی تاریخ کا سب سے المناک دن وہ ہے، جب پہلا ناول شائع ہوا۔ داستانوں کی روایت کو مردہ قرار دے کے ناول لکھنے کے لیے قلم اُٹھانا گویا کائنات کو تصور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے ایک اُسلوب سے، اس پوری تہذیب سے، جس کی کوکھ سے اس اُسلوب نے جنم لیا تھا، ایمان اٹھ جانے کا اعلان تھا۔''[8]

گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ ہمیں اپنے تہذیبی پس منظر کے ساتھ چلنا چاہیے، چاہے اس میں اساطیر بھی آ جائیں۔ ان کے دور میں ادبِ لطیف کا ہر پرچہ اپنی گزشتہ روایت سے ہٹ کر، گزری تہذیب کا نوحہ بن کر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ یوں گلہ کرتے ہیں:

> وہ بدنصیب تہذیب یونیورسٹیوں سے پٹی پڑی ہے، مگر داستان گویوں اور کہانی سنانے والی نانیوں، دادیوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اس لیے وہاں پر تنقید بکثرت ملے گی مگر ایلیڈ اور اوڈیسی اس تہذیب کے لیے روحانی واردات نہیں ہیں۔[9]

وہ آئے تو ادبِ لطیف کے اداریے، تخلیقات اور تبصرے سبھی کا موضوع بدل گیا۔ ماضی کے شعور سے کمک لینے کے لیے سانپوں کے قصے اور بسنت میلے تہذیب کی علامت بن کر چھانے لگے، لیکن دوسری طرف ترقی پسندوں کو نشانۂ تنقید بنانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جب جب معاشرے سے کوئی رسم رخصت ہوئی ذمہ دار ترقی پسند ٹھہرائے گئے۔

> ''زوال پسند داستان گو ہار گئے، ترقی پسند ادیب اور جماعت اسلامی کے مولوی خوش رہے۔''[10]

میر تقی خیال سے گلہ ہوا تو بھی یوں ہوا:

> ''مزاج کے اعتبار سے میر تقی خیال کچھ کچھ اشتراکیوں سے مشابہ ہیں یعنی جو عیب وہ دوسروں کی داستانوں میں نکالتے تھے وہ خود ان کی داستانوں میں بڑے دھڑلے سے موجود ہیں۔''[11]

ترقی پسندوں سے ناپسندیدگی اس انتہا کو پہنچی کہ انھوں نے ادبِ لطیف میں سے ترقی پسندی کے عناصر اور ترقی پسندوں کی تخلیقات کو یکسر نکال باہر کیا۔ یہ ایک اعتبار سے انتہا پسندی تھی کیوں کہ ادبِ لطیف کے آغاز مارچ ۱۹۳۵ء سے لے کر ستمبر ۱۹۶۲ء تک یہ پرچہ ترقی پسندوں کا آرگن ہونے کے باوجود اعتدال کی راہ پر گامزن رہا تھا۔[12] ترقی پسندی سے حد درجہ لگاؤ کے باوصف اس کے مدیر دوسرے ایسے تخلیق کاروں کو بھی شائع کرتے رہے جنھیں ترقی پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خود انتظار حسین کا پہلا

افسانہ ''قیوما کی دکان'' [۱۳] ادبِ لطیف ہی میں شائع ہوا تھا۔

انتظار حسین نے مسند ادارت پر براجمان ہوتے ہی ادبِ لطیف کی پالیسی کو جیسے یکسر تبدیل کیا تھا اس پر پرانے ترقی پسند سراپا احتجاج بن گئے۔ مثلاً عارف عبدالمتین جو ادبِ لطیف کے مدیر بھی رہ چکے تھے انھوں نے کھل کر تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا:

> آج کل کے ادبِ لطیف کو دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔۔۔ میں تو کہوں گا کہ ادبِ لطیف سے اس کی روح چھین لی گئی ہے۔۔۔ چوہدری برکت علی آزادی اور حریت کے شیدائی تھے وہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھے اور چوں کہ ترقی پسند مصنّفین بھی اسی نظریے کے قائل تھے لہٰذا یہ پرچہ چوہدری مرحوم نے ترقی پسند مصنّفین کے لیے نکال رکھا تھا۔۔۔ اب اس کی پالیسی کیا ہے وہ ہی جو انتظار حسین مدیر ادبِ لطیف کی ہے وہ کیا پالیسی ہے جو یورپ میں یونگ نے ایک تحریک سرریلزم چلائی تھی۔ انتظار اسی انداز میں نانی اماں کے حوالے سے ادب میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اندازِ تحریر بالکل surrealistic ہے۔۔۔ یہ ادب زندگی اور شعور سے بہت دور ہے۔۔۔ لہٰذا اس لحاظ سے surrealist لوگ رجعت پسند ہیں اور ہم لوگ ترقی پسند ہیں۔'' [۱۴]

اگر ہم عارف عبدالمتین کے اس شکوے ''اب اس کی پالیسی کیا ہے وہی جو انتظار حسین مدیر ادبِ لطیف کی ہے'' کو مشل فوکو کی ڈسکورس تھیوری کے حوالے سے دیکھیں تو پھر یوں تو ہوتا ہے۔ جب ہم ڈسکورس کی بات کرتے ہیں تو ایک طرح سے ڈسکورس سے پیدا ہونے والے اثرات کی بات کر رہے ہوتے ہیں اس میں کئی قسم کے اثرات پائے جاتے ہیں مثلاً سچ کا اثر، طاقت کا اثر، علم کا اثر، وغیرہ وغیرہ۔ فوکو کے اس ڈسکورس میں طاقت ایک بہت اہم عنصر ہے۔ طاقت سے مراد کسی چیز پر قبضہ نہیں کسی کا حق چھیننا نہیں بلکہ فوکو کے نزدیک طاقت سے مراد کسی کو اپنی خواہش کے مطابق سوچنے سے روکنا یا کسی کی آزادی کو محدود کرنا ہے۔ [۱۵] سچ یہ ہے کہ طاقت اور طاقت کا استعمال انسان کے تمام رشتوں اور تمام رویوں میں موجود ہے۔ فوکو ڈسکورس سے مراد خیالات، رویے، نظریے، موقف سبھی کچھ لیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو ڈسکورس کی طاقت رکھتے ہیں وہ ان کو جو ڈسکورس کی طاقت نہ رکھتے ہوں اپنے حکم پر چلاتے ہیں اور وہ یہ بھی طے کرتے ہیں کہ لوگوں کو کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔ انتظار حسین مدیر بن کر آئے تھے تو اپنی شرائط پر آئے تھے طاقت کا فلسفہ تو پھر یہی ہے کہ جیسا انھوں نے چاہا ویسا ہی ہوا اور یہ انھوں نے طے کیا کہ اب ادبِ لطیف میں کیا چھپے گا اور کیا نہیں، کون چھپے گا اور کون نہیں (مالکان کو بولنے کی اجازت بھی شاید انھوں نے نہ دی ہوگی) ڈسکورس تھیوری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ طاقت اپنا مرکز بدلنے کے ساتھ کمزور بھی ہوتی ہے۔ انتظار حسین سے پہلے ترقی پسند اس مجلّے کے ذریعے اپنے پرجوش خیالات کی اشاعت کرتے تھے بڑا گھن گرج والا انداز ہوتا تھا مثلاً:

> ترقی پسندوں کو رجعت نوازوں کی فریادوں اور ہچکیوں سے بے پرواہ ہو کر نظامِ حیات کو متحرک کرنا تھا سو انھوں نے یہ بیڑا ایسی بلند حوصلگی سے اٹھایا کہ آج ان کی کارکردگی کا ایک زمانہ معترف ہے اور اکثریت نے بیداری کی ابتدائی انگڑائیاں مکمل کر لی ہیں اب صف بستہ ہو کر آگے لپکنے اور چھا جانے کا وقت ہے۔ [۱۶]

اور وہ واقعی چھا بھی گئے، لیکن ظاہر ہے طاقت اپنا مرکز بدلتی ہے اور کمزور بھی ہوتی ہے۔ ادبِ لطیف کی مسندِ ادارت ترقی

پسندوں کے ہاتھ سے نکلی، ترقی پسند کمزور پڑے اور ادبِ لطیف ایک اور طاقت ور نظریے اور موقف کا آرگن بن گیا۔

انتظار حسین نے اپنے پہلے اداریے میں یہ بھی کہا تھا کہ ایک زندہ ادبی رسالے میں بہت کچھ ایسا چھپتا ہے جسے عام زبان میں ''الابلا'' کہا جاسکتا ہے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ادبِ لطیف کے کسی شمارے میں ایسی غزل چھپے جو ناشائستہ اور کھردری ہو۔ گو ان کے ''الابلا'' کا دفاع آصف فرخی نے یوں کیا ہے:

> اس کے پیچھے یہ خیال ہے کہ زندہ اور معاصر ادب اپنے چاروں طرف کی زندگی سے اخذ و استفادہ کرتا ہے اور صرف معیاری صورتوں سے نہیں بلکہ تغیر پذیر صورتوں میں بھی سامنے آتا ہے۔ لطافت بھی کثافت کے بغیر جلوہ گر نہیں ہوسکتی۔[۱۷]

اکتوبر ۶۲ء کے ادبِ لطیف میں اختر احسن کی غزل چھپی جیسے ''جینی غزل'' کہا گیا، لیکن بعد میں اسے اگلے شمارے نومبر ۶۲ء میں ''زین غزل'' کہہ کر تصحیح کی گئی۔

یہ کا میٹھا میٹھا رس ٹوٹ رہی ہے اک اک نس
جاگا تو بدمست ہوا پھر نہ ہوا میں ٹس سے مس[۱۸]

دسمبر ۶۲ء کے شمارے میں انجم رومانی کی ایک ایسی غزل شائع ہوئی جس کا قافیہ، کوڈو، بابو، الو، مٹھو، جھاڑو تھا جب کہ جون ۶۴ء کے شمارے میں احمد تنویر کی غزل چھپی جس کا ایک مصرعہ تھا ''سمجھو تو پھر غلیل ہماری غلیل ہے''۔ انتظار حسین نے صرف اس ''الابلا'' کا تجربہ ہی نہیں کیا انھوں نے بشیر بدر کی ٹیڈی غزل کو بھی مجلّے کا حصہ بنایا۔

چست کپڑوں میں جسم جاگ پڑے روح و دل کو سلا رہے ہیں ہم
ٹیڈی تہذیب ٹیڈی فکر و نظر ٹیڈی غزلیں سنا رہے ہیں ہم[۱۹]

لیکن یہ تجربے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ پرانی اردو کو بھی شائع کرتے رہے۔ مثلاً خواجہ فرید کی کافیاں (جنوری ۶۴ء) امیر خسرو کا کلام (فروری ۶۳ء) اور بلھے شاہ کی پنجابی سے ترجمہ شدہ اردو شاعری (مئی ۶۳ء) وغیرہ وغیرہ۔

مجھے جو انٹرویو انھوں نے جون ۱۹۹۷ء میں دیا تھا اس میں انھوں نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ وہ لوگوں میں اختلاف کی روح پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ تخلیق کار خصوصاً نوجوان عام روش سے ہٹ کر چلیں، روایتی انداز نہ اپنائیں۔ اختر احسن کی زین غزلیں جو اینٹی غزل تھیں اسی خواہش کا نتیجہ تھیں اور زین بدھ ازم کا ایک سلسلہ بھی ہے۔ ایک سطح پر دیکھیں تو وہ دور ہی ادب میں ہنگامے برپا کرتا دور تھا۔ لسانی تشکیلات کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ حقیقت نگاری سے دور علامت اور استعارے کا اُسلوب پسندیدگی کا درجہ پا رہا تھا۔ یہ اُسلوب نیا ضرور تھا لیکن اس عہد کا نمائندہ تھا اور پھر انتظار حسین اس کی حوصلہ افزائی کیوں نہ کرتے کہ اس اُسلوب پر ترقی پسند معترض تھے اور انتظار حسین اس بات کے قائل:

> ادب میں آخری اور قطعی طرزِ اظہار کوئی نہیں ہوتا۔ تخلیقی اظہار میں تجربے کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کسی ایک عہد میں دریافت ہونے والے اُسلوب پر اس طرح ایمان لے آنا کہ جیسے وہ ادب میں آخری پیغام ہے، غیر ادبی رویہ ہے۔

یہ ادب میں بنیاد پرستی کی مثال ہے۔ ترقی پسند مکتبۂ فکر کے نقاد بالعموم اس بنیاد پرستی کے شکار نظر آتے ہیں۔[۲۰]

۶۰ء کی دہائی سے آغاز کرنے والا نیا افسانہ فرد کی تنہائی، عدم تحفظ، خوف، معاشی، معاشرتی اور سیاسی جبر، آزادئ اظہار کے فقدان، شناخت اور نام کی کھوج اور ذات کی گم شدگی کا افسانہ تھا، تکنیک کے اعتبار سے روایتی اظہار کی قید مثلاً واضح پلاٹ، کردار، کہانی اور تاثر سے آزاد تھا۔ انتظار حسین نے ایسے سب لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جو نئے انداز کے ساتھ اُبھر رہے تھے۔ مثلاً خالدہ اصغر، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مینرا وغیرہ وغیرہ۔

''میں ایک تنہا اور خوف زدہ انسان، ایک دوسرے تنہا خوف زدہ انسان کے سینے کے ساتھ سر لگائے سسکیاں بھر رہا تھا اور تمام کائنات میں سائیں سائیں کرتی تنہا رات بھری تھی۔''[۲۱]

''میں نے پوچھنا چاہا، کیا یہ احساس لحاتی ہے مگر میں نے محسوس کیا ہاتھ نہیں ہیں لمس موجود ہے، لمس کا احساس زندہ ہے، میں مسکرا کر خاموش ہوگیا، شاید یہی احساس سب کچھ ہے۔''[۲۲]

فکشن ہو یا تنقید انتظار حسین روایت اور تہذیب سے رشتہ جوڑے بنا رہ نہیں سکتے۔ بحیثیت مدیر انھوں نے ادبِ لطیف میں ان ناقدین کو بیشتر شائع کیا جو انھی کے قبیلے سے تھے اور جن کی تنقید کے مباحث اسلامی اور پاکستانی ادب اور تہذیب کے مسائل تھے۔ مثلاً محمد حسن عسکری کے ''نئی اصطلاحیں اور اسلامی تصورات'' (اکتوبر ۶۲ء) سجاد باقر رضوی کے ''ہمارا عہد اور تنقید'' (اگست ستمبر ۶۳ء جلد ۶۳، شمارہ ۲،۳)، مظفر علی سید کے ''اردو ادب اور اسلامی تہذیب (اگست ستمبر ۶۳ء)، منیر احمد شیخ کے ''روایت کا شعور'' (اگست ستمبر ۶۴ء، جلد ۶۹، شمارہ ۱۰)، جیلانی کامران کے ''اسلام اور مائتھالوجی'' (جنوری ۶۳ء) وغیرہ وغیرہ میں انھی خیالات کو پیش کیا گیا۔

میں قوم و مملکت و قومی تہذیب و روایات کے آپس کے رشتے کو جسم و روح کے رشتے سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی لیے آج کے ناقد سے میرا تقاضا یہ ہے کہ وہ ادب اور زندگی کے رشتے کو اس طرح استوار کرے کہ ادبی تنقید میں قومی تہذیب و روایات و اقدار پر زور دے اور اس طرح قومی احساس کو مضبوط کرے۔[۲۳]

ادبِ لطیف میں تراجم کی مضبوط روایت ملتی ہے۔ انتظار حسین سے پہلے ایسے مصنّفین اور شعراء کو تواتر سے ترجمہ کیا گیا جو ادبِ لطیف کی ترقی پسندانہ روش سے قریب تھے یا جن کی تحریریں حقیقت پسندانہ تھیں مثلاً چیخوف، گورکی، دوستوفسکی، مائیکل شولوخوف، چارلس ڈکنز وغیرہ۔ ان کے علاوہ ٹالسٹائی، موپساں، سومرسٹ ماہم، رائیڈر ہیگرڈ، ہارڈی، شیلے، کیٹس، کالرج کو بھی ترجمہ کیا گیا، لیکن انتظار حسین نے ادبِ لطیف کے تراجم میں بھی ایک نئی روایت کو جنم دیا۔ چیخوف اور موپساں تو ترجمہ ہوئے لیکن باقی اشتراکی اور رومانوی بدیسی تخلیق کار غائب ہو گئے۔ اب جن ادیبوں کو ترجمہ کیا گیا ایک سطح پر وہ اس عہد کی فکری تبدیلیوں کا تقاضا بھی تھا۔ اس دور میں سماجی حقیقت نگاری سے زیادہ نفسیاتی الجھنیں، شعور اور لاشعور کی کارفرمائیاں زیرِ بحث تھیں۔ لایعنیت اور فرد کے نفسی مسائل اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ انتظار حسین نے ابہام پرستوں کو اہمیت دی اور شعوری سطح پر البرٹ کامیو، فرانز کافکا، وائٹ ہیڈ اور ایزرا پاؤنڈ کے ساتھ جیمز جوائس، او ہنری اور بورخیس کو ترجمہ کرایا۔ بورخیس اردو ادب میں ۸۰ء کی دہائی میں مقبول ہوا، لیکن انتظار حسین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے بورخیس کو ۱۹۶۲ء میں ترجمہ کرایا اور ادبِ لطیف میں شائع کیا۔ کافکا، کامیو، جوائس اور

بورخیس یہ سب اپنی علامت پسندی اور پیچیدگی اظہار کے لیے معروف ہیں اور انتظار حسین نے انھیں شائع کر کے اس عہد کے رجحانات کو بڑی تقویت دی۔

انتظار حسین اردو ادب کے لیے لیجنڈ بن چکے ہیں اور اب تو انھیں شاید اس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ ممکن ہے انھیں ادبِ لطیف کی ادارت کا ذکر بھی کچھ ایسا اہم معلوم نہ ہو، لیکن اگر طاقت کے فلسفے کے تناظر میں دیکھیں تو اہمیت بنتی ہے اور قائل ہونا پڑتا ہے کہ واقعی جو اختیار رکھتے ہیں سکہ انھی کا چلتا ہے۔ انتظار حسین مختصر سے عرصے کے لیے ادبِ لطیف کی دنیا میں داخل ہوئے لیکن اس مختصر عرصے میں ہی انھوں نے ایسا انقلاب برپا کیا اور پرچے میں سے ترقی پسندی کے عنصر کو ایسا نکال باہر کیا کہ پھر ۱۹۸۰ء تک آنے والے مدیروں نے اسے ترقی پسندی کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین: ''نظریئے سے آگے''، ۲۰۰۴ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۳۳۔

۲۔ مقتدر و موقر رسائل و جرائد کی آرا کے اقتباسات، ادبِ لطیف، ستمبر ۱۹۳۵ء، جلد ۲، شمارہ ۱، ص ۲۔

۳۔ ''میں محسوس کرنے لگا کہ کام بقدر حوصلہ نہیں کر رہا۔ پرچے کے معیار کو بلند رکھنا میری خواہش کے تو بہت قریب ہے، مگر جو ذرائع مجھے حاصل ہیں ان سے بہت دور ہے۔ دل میں ہمہ وقت ایک کشمکش سی ہونے لگی آخرکار ادبِ لطیف سے الگ ہوگیا۔' (میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ۱۹۸۴ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۳۷۵)۔

۴۔ انتظار حسین: ''چراغوں کا دھواں''، ۱۹۹۹ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۵۔

۵۔ انتظار حسین، پہلا لفظ (اداریہ) ادبِ لطیف، اکتوبر ۶۲ء، ص ۳۔

۶۔ انتظار حسین: ''علامتوں کا زوال''، ۱۹۸۹ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۱۔

۷۔ انٹرویو انتظار حسین، انٹرویو پینل گلزار وفا چوہدری، روزنامہ خبریں ملتان، سنڈے میگزین، ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۔

۸۔ پہلا لفظ (اداریہ) ادبِ لطیف، دسمبر ۶۲ء، ص ۳۔

۹۔ پہلا لفظ (اداریہ) ادبِ لطیف، جون ۶۳ء، ص ۳۔

۱۰۔ پہلا لفظ (اداریہ) ادبِ لطیف، فروری ۶۳ء، ص ۳۔

۱۱۔ انتظار حسین: سلسلہ'' پتھر کے ورق'' تعارف'' بوستانِ خیال''، ادبِ لطیف، نومبر ۶۲، ص ۵۴۔

۱۲۔ انتظار حسین سے پہلے مرزا ادیب ''ادبِ لطیف'' کے مدیر کی حیثیت سے بہت معتدل رویے کے حامل رہے تھے وہ خود کہتے ہیں کہ ''ترقی پسند تحریک کا ترجمان ہونے کے باوجود میری زیرِ ادارت جریدے نے رومانی تخلیقات کو جگہ دینے میں کبھی کسی تعصب یا مصلحت سے کام نہیں لیا۔ بعض احباب اس پر معترض بھی ہوئے لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔' (انٹرویو ''مرزا ادیب سے مکالمہ'' ادارہ ادبِ لطیف، جون ۹۱ء، جلد ۵۶، شمارہ ۶، ص ۱۲)۔

۱۳۔ ادبِ لطیف، جون ۱۹۴۸ء، جلد ۲۷، شمارہ ۳، ص ۵۳۔

۱۴۔ عارف عبدالمتین: ''بانی ادب لطیف کی یاد میں''، ادبِ لطیف جوبلی نمبر ۶۳، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

۱۵۔ Sara Mills, "Discourse", 1997, New York, Routledge, P.19

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی : ''اشارات'' (اداریہ) ادبِ لطیف، اکتوبر نومبر ۴۳ء، جلد ۱۸، شمارہ ۲،۳، ص ۲۔

۱۷۔ آصف فرخی، ڈاکٹر: ''انتظار حسین، شخصیت اور فن''، ۲۰۰۶ء، پاکستان اکادمی ادبیات، ص ۱۶۶۔

۱۸۔ اختر احسن: ''زین غزل''، ادبِ لطیف، اکتوبر ۶۲ء، ص ۲۹۔

۱۹۔ بشریٰ بدر: ''ٹیڈی غزل''، ادب لطیف، سالنامہ مارچ اپریل ۶۳ء، ص ۵۹۔

۲۰۔ انتظار حسین: ''نظریے سے آگے''، ۲۰۰۴ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۲۲۷۔

۲۱۔ خالدہ اصغر: ''ایک بوند لہو کی خاطر''، ادب لطیف، سالنامہ مارچ اپریل ۶۳ء، ص ۱۲۲۔

۲۲۔ سریندر پرکاش: ''رہائی کے بعد''، ادب لطیف، مارچ ۶۵ء، جلد ۱۷، شمارہ ۳، ص ۵۶۔

۲۳۔ سجاد باقر رضوی: ''ہمارا عہد اور تنقید''، ادب لطیف، اگست ستمبر ۶۳، ص ۳۴۔